بطلِ حریت

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ

اور ان کی

تحریکِ ریشمی رومال

ایک مختصر تعارف

تحریر:

محمد سلمان منصور پوری

مدرسہ شاہی مرادآباد

ناشر:

شعبۂ نشر واشاعت جمعیۃ علماء ہند، بہادر شاہ ظفر مارگ نئ دہلی-٦

پیش لفظ

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم، أما بعد!

تجربہ اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرات اکابر، مخلص خدام دین اور اہل اللہ کی سوانح حیات اور خدمات عالیہ کے مطالعہ سے کچھ اسی طرح کے فوائد نصیب ہوتے ہیں جیسے ان کی مجالس اور مواعظ سے حاصل کئے جاتے ہیں، خاص کر جب ان حضرات کی زندگی سے خود اپنی ذات کا موازنہ کیا جائے تو اپنی کوتاہیاں کھل کر سامنے آتی ہیں، اور ناتوانی کے باوجود کچھ نہ کچھ دینی خدمت کر گذرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضرات اساتذہ کرام طلبہ کو اکابر کی قربانیوں اور اُن کی مجاہدانہ خدمات پر مشتمل کتابوں اور مضامین کے مطالعہ کی تلقین کرتے آئے ہیں۔

ہمارے طبقۂ اکابر میں عزم وہمت اور قومی وملی خدمات کے اعتبار سے بطل حریت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہٗ کو ممتاز حیثیت حاصل ہے، حضرت شیخ الہند نے اسلامی غیرت وحمیت اور قومی وملی خدمت کی ایسی تابناک مثال پیش کی ہے، جو آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ رہنمائی کا ذریعہ بنتی رہے گی، شیخ الہندؒ نے یہ انقلابی نظریات اپنے استاذ معظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمائے تھے، اور پوری زندگی بے مثال استقامت کے ساتھ انہی نظریات پر نہ صرف قائم رہے؛ بلکہ عملی طور پر ان کی تبلیغ واشاعت کا فرض بھی انجام دیتے رہے، اور پھر یہ امانت کامل طور پر اپنے پر عظمت شاگردوں کی طرف منتقل کردی، **فجزاهم الله تعالىٰ أحسن الجزاء۔**

حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا ایک روشن ترین کارنامہ ''تحریک ریشمی رومال'' بھی ہے، جسے آپ نے دیوبند جیسے غیر معروف قصبے سے خفیہ طور پر شروع کیا تھا، اور جس کی منصوبہ بندی ملک اور بیرونِ ملک کو محیط تھی، یہ تحریک اگرچہ منصوبہ کے مطابق کامیاب نہ ہوسکی؛ لیکن اس نے اپنی کوکھ سے

ایسی انقلابی تحریکوں کو جنم دیا جنہوں نے بالآخر ۱۹۴۷ء میں ملک کو انگریزوں سے بے دخل کر کے دم لیا، ان تحریکات میں خلافت تحریک، اور جمعیۃ علماء ہند خاص طور پر نمایاں ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی مرکزی قیادت نے ''تحریک شیخ الہند'' کے سو سال پورے ہونے پر اس تحریک کے پورے ملک میں تعارف کا نظام بنایا ہے، جس کے تحت جا بجا سیمیناروں اور یادگاری جلسوں کے ذریعہ عوام وخواص کی ذہن سازی کی جائے گی، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

اِسی سلسلہ میں یہ تعارفی کتابچہ پیش کیا جارہا ہے؛ تاکہ مختصر انداز میں حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت اور اُن کی تحریک ونظریات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاسکیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو قبول فرمائیں اور اکابر کے مشن پر ہم سب کو چلنے کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین۔

فقط واللہ الموفق

احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہٗ

۱۲/ ۷/ ۱۴۳۳ھ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہٗ

اور ان کی

تحریک ریشمی رومال

استاذ الاساتذہ شیخ العالم، عارف باللہ، بطل حریت، مجاہد جلیل، شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہ (م ۱۳۳۹ھ) کا نام نامی جب لیا جاتا ہے تو یکا یک قلب و دماغ میں جھری جھری سی آتی ہے اور غیر شعوری طور پر ایک ان جانے جوش سے بدن کا رُواں رُواں سرشار ہو جاتا ہے۔ یہ اثر ہے اس عظیم محسن قوم وملت کے بے نظیر جوش عمل، اور اس مرد مجاہد کے بے مثال تدبر کا، جس کے کارناموں کے ان مٹ نقوش ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نیرّ تاباں بن کر چمکتے رہیں گے، جس کا علمی اور روحانی فیض پوری قوت کے ساتھ انشاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا اور جس کے بلند پایہ خیالات اور وطنی و دینی جذبات سے آنے والی نسلیں برابر مستفیض ہو کر اپنی کامیاب زندگی کے خطوط متعین کرتی رہیں گی۔

ولادت اور تعلیم

حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ء (۱۸۵۱ء) میں بریلی میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، چھ سال کی عمر میں دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت میاں جی بنگلوریؒ کے پاس تعلیم کا آغاز فرمایا، اس کے بعد عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں میانجی عبداللطیف اور مولوی مہتاب علی سے پڑھیں، حسن اتفاق کہ ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو

دیوبند کی چھتہ مسجد میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس کے اولین اساتذہ میں صاحب معرفت بزرگ ملا محمود دیوبندیؒ اور ان کے اولین شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شامل تھے۔ اسی سال استاذ الاساتذہ جامع العلوم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ بھی یہاں رونق افروز ہو گئے اور ایک عظیم چشمۂ روحانی سرزمین دیوبند سے جاری ہو گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی علمی اور روحانی ماحول میں پروان چڑھنے لگے۔

استاذ اعظم کی خدمت میں

۱۲۸۶ھ میں آپ نے اپنے عظیم ترین استاذ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں صحاح ستہ کا آغاز فرمایا اس وقت حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے پھر بعد میں دہلی منتقل ہو گئے اور اس دوران دیوبند اور نانوتہ بھی بکثرت آمد و رفت رہی، حضرت شیخ الہندؒ علم کی طلب اور استاذ کی خدمت کی غرض سے سفر وحضر میں استاذ مکرم کے ساتھ رہنے لگے اور اپنی پوری زندگی اور زندگی کی سب چاہتیں اپنے نابغۂ روزگار استاذ پر نچھاور کر دیں، آپ کی کمالِ سعادت مندی، نیاز مندی اور جاں سپاری کی بدولت آپ کو استاذ مکرم کی طرف سے ایسی شفقتیں اور عنایتیں نصیب ہوئیں کہ آپ اس معاملہ میں اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے گئے اور حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علمی و روحانی فیض کی اشاعت کا بڑا ذریعہ قدرت خداوندی نے آپ ہی کو بنا دیا، حضرت شیخ الہندؒ نے استاذ معظم حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ سے محض علوم دینیہ ہی میں شرف تلمذ حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ آپ نے اپنے دل میں استاذ کے سینہ میں لگی ہوئی وہ آگ بھی سلگا لی تھی جس نے انہیں ۱۸۵۷ء میں شاملی کے میدان میں سربکف ہو کر انگریز دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گویا کہ یوں کہیے کہ ''قاسم'' نے جب مئے عرفان ومحبت تقسیم کی تو ''محمود'' نے اپنے دامن کو آئینہ بنا کر ساقی کی صورت وسیرت حتی کہ اس کے ارادے اور عزائم بھی اپنے اندر جذب کر لیے، اب قاسم ومحمود الگ الگ نہیں رہے، بلکہ ایک جان دو قالب بن گئے۔ جو ''قاسم'' سوچتے وہی ''محمود'' کا مطمح نظر ہوتا، اور جو ''محمود'' منصوبہ بناتے وہ ''قاسم'' ہی کی ترجمانی ہوتی تھی۔ جس کا کچھ اندازہ آپ کی سیاسی واصلاحی تحریکات سے لگایا جا سکتا ہے۔

فیضان علمی

۱۲۸۹ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس کے طور پر تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، ۱۲۹۰ء میں منعقد ہونے والے پہلے عظیم الشان جلسۂ دستار بندی میں وقت کے اکابر و معظم علماء کے ذریعہ آپ کو دستار فضیلت عطا ہوئی، ۱۲۹۲ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کا باقاعدہ مدرس بنایا گیا، اور اگلے ہی سال (۱۲۹۳ء) سے آپ نے دورۂ حدیث شریف کی اعلی کتابوں کا درس دینا شروع فرمادیا جو متواتر ۴۴ ر سال تک جاری رہا۔ اور اس دوران سینکڑوں تشنگان علوم نبوت نے آپ سے استفاضہ کیا اور پورے برصغیر میں آپ کی شہرت وقابلیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ ۱۳۰۵ء سے تاحیات یعنی ۳۴ ر سال تک آپ نے دارالعلوم کی بلند پایہ صدارت تدریس کو بھی زینت بخشی، جو بجائے خود ایک امتیاز ہے۔

آپ کا درس اپنی نرالی شان رکھتا تھا، علوم نبوت کا وہ فیضان تھا کہ الفاظ ان کا بیان کرنے سے عاجز تھے۔ جس مسئلہ پر گفتگو شروع ہو جاتی لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مبدأ فیاض نے آپ کا سینہ علم و معرفت کے لیے کھول دیا تھا۔ علماء کے اقوال کی توجیہات، متعارض نصوص میں تطبیق، مسلک حقہ کی تائید اس انداز میں فرماتے کہ ہر شخص مطمئن ہو جاتا، خود آپ کے اکابر اور اساتذہ کو بھی آپ کے علم کا اعتراف تھا چناں چہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ’’مولوی محمود حسن علم کا کٹھلا ہیں‘‘ یعنی ان کے رگ و پے میں علوم نبوت رچ اور بس گئے ہیں۔

سلوک و معرفت

ایک طرف یہ علمی تبحر تھا اور دوسری طرف آپ سلوک معرفت میں بھی اپنے وقت کے امام تھے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جب آپ نے اپنے استاذ معظم حضرت نانوتویؒ کے ہمراہ پہلی مرتبہ حج مبرور کی سعادت حاصل فرمائی تو مکہ معظّمہ میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور حضرت حاجی صاحبؒ نے اسی سفر میں آپ کو خلافت و اجازت سے بھی مشرف فرمادیا، اسی نسبت خاصہ کا اثر تھا کہ آپ کی

پوری حیات طیبہ اتباع سنت مبارکہ سے عبارت تھی۔ تواضع وعاجزی کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمام تر کمالات علمیہ وعملیہ اور وجاہت وقبولیت کے باوجود کوئی شخص آپ کی ظاہری کیفیت دیکھ کر آپ کے مقام ومنصب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ذوق اطاعت اور شوق عبادت ایسا تھا کہ آپ کے معمولات دیکھ کر جوانوں کو شرم آجاتی۔ گفتگو میں متانت، نرمی اور سنجیدگی غالب تھی۔ اور دل میں نصیحت وخیر خواہی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے مردم شناسی اور افراد سازی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اسی کمال کا نتیجہ تھا کہ آپ کے شاگردوں کے ذریعہ پورا عالم علم حدیث کی روشنی سے منور ہوگیا۔ آج جدھر نظر ڈالئے شیخ الہند کے شاگردوں کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (جو بکمال ادب اپنے استاذ معظم کو ''شیخ الہندؒ'' کے بجائے ''شیخ العالم'' کے لقب سے یاد فرماتے تھے) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ وغیرہ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے ہی یہ مقام حاصل کیا ہے۔ سچ ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست ❖ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تحریک شیخ الہند

علم وعمل کی مسند سجانے اور اشاعت علوم نبوت کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ شیخ الہندؒ احوال زمانہ سے بھی کبھی غافل نہیں رہے۔ بلکہ انہوں نے دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر پورے عالم کے حالات پر نظر رکھی۔ لوگوں کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ زاہد فی الدنیا بزرگ جس کی ظاہری زندگی مسجد اور مدرسہ تک محدود ہے۔ اور جس کا منحنی سا وجود علوم نبوت کے لعل وجواہر ڈھونڈنے میں ہمہ وقت مشغول ہے، کیا وہ کسی بین الاقوامی تحریک کی قیادت بھی کرسکتا ہے؟ اور کیا وہ ایسی حکومت کی بنیادیں، ہلانے کی بھی طاقت رکھتا ہے؟ جس کی حکومت میں اس دور میں سورج

غروب نہیں ہوتا تھا؟ یہ بات شاید کسی کے وہم وخیال میں بھی نہ گذرتی ہوگی، مگر آگے جا کر وقت نے بتا دیا کہ یہی مجاہد استاد کا مجاہد شاگرد ''محمود حسن'' تھا جو دسیوں سال دیوبند میں بٹھ کر خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزی ریشہ دوانیوں، بلقان وطرابلس کی خوں چکاں داستانوں، اور عالم عرب پر انگریزی چیرہ دستیوں پر کرب کی حالت میں راتوں کو کروٹیں بدلتا رہا، اور جس نے بالآخر ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو انگریز سے نجات دلانے کے لیے ایک تحریک کا منصوبہ بنایا جسے بعد میں ''تحریک شیخ الہندؒ'' یا ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے جانا گیا۔ یہ تحریک کیا تھی؟ کہاں سے شروع ہوئی؟ کن کن مراحل سے گذری؟ اور پھر اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب درج ذیل مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ (حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیل حالات کے لئے ''حیات شیخ الہندؒ'' مؤلفہ حضرت مولانا سید اصغر علی صاحبؒ اور نقش حیات جلد دوم مؤلفہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا مطالعہ کیا جائے)

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد

لوگ کہتے تھے کہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۷ء) میں دیوبند میں قائم ہونے والا دارالعلوم ایک خالص دینی ومذہبی مدرسہ ہے۔ مگر شیخ الہندؒ کی سوچ سب سے الگ تھی، ان کے سامنے جب دارالعلوم کو صرف مرکز تعلیم وتعلم کے بطور پیش کیا جاتا تو ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی، صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا، اور بے اختیار اصل حقیقت زبان پر آجاتی، ایک مرتبہ آپ کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے آپ کے سیاسی مسلک کے بارے میں سوال کیا، اس پر آپ کا ردعمل کیا تھا؟ خود مولانا گیلانیؒ کی زبانی سنئے:

''اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے۔ اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم جن کو وہ ''حضرت الاستاذ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے انہی کا نام لیکر فرمایا'' کہ حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا (صرف) درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی تلافی کی جاسکے'' پھر ارشاد ہوا: ''تعلیم وتعلم جن کا مقصد اور نصب العین ہے ان کی راہ میں میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لئے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذؒ نے قائم کیا تھا''۔ (دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن ''مولانا گیلانی''، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جمادی الثانیہ ۱۳۷۳ھ)

یہی وہ نظریات وخیالات تھے جن کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے اور اس ملک میں اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کیلئے ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کا منصوبہ بنایا، اور ظاہری اسباب ووسائل نہ ہونے کے باوجود خدمت دین وطن کیلئے جدوجہد شروع کردی۔

انجمن ثمرۃ التربیت

ابھی دارالعلوم کے قیام پر ایک دہائی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں اس عظیم مرکز کے سب سے پہلے فرزند جلیل مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے رفقاء کی اعانت اور اپنے استاذ جلیل مجاہد حریت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایما پر ''سالانہ چندہ دہندگان'' کے عنوان سے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ''ثمرۃ التربیت'' تجویز کیا گیا، اس جمعیۃ عظمیٰ میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ اٹھارہ اور مرکزی ارکان تھے، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں (۱) مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ (۲) مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۳) مولانا عبدالحق صاحب پرقاضویؒ (۴) مولوی محمد فاضل صاحب ساکن پھلتؒ (۵) مولوی میر محمد صادق صاحب مدراسیؒ (۶) مولوی عبدالقادر صاحب دیوبندیؒ (۷) مولوی فتح محمد صاحب تھانویؒ (۸) مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھویؒ (۹) مولانا محمد مراد صاحبؒ پاک پٹن (۱۰) مولانا عبداللہ صاحب گوالپاڑیؒ (۱۱) مولانا عبدالعلی عبداللہ پوری میرٹھیؒ (۱۲) مولانا نہال احمد صاحب دیوبندیؒ (۱۳) مولوی عبداللطیف صاحب سہسپوری (۱۴) مولوی عبداللہ صاحب جلال آبادیؒ (۱۵) مولوی محمد اعلیٰ صاحب انبیٹھوی (۱۶) مولوی محمد عبدالعدل

صاحب پھلتی (۱۷) مولانا کوثر صاحب نگینویؒ (۱۸) مولانا کرامت اللہ صاحب دہلویؒ۔(پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی الرشید دارالعلوم نمبر ۲۸۲/۲۸۳)

اس انجمن کا مقصد اصلی کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مؤرخ تحریک آزادی حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کا یہ تجزیہ لائق مطالعہ ہے، مولانا انجمن کے مقاصد پر چند قرائن ذکر کر کے تحریر فرماتے ہیں: ''بہرحال اس پس منظر کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ثمرۃ التربیت سے صرف فضلا و منتسبین دارالعلوم کی تنظیم مقصود نہیں تھی؛ بلکہ دراصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا جو قیام دارالعلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلے میں کام کرسکیں''۔(اسیران مالٹا ۱۲)

لیکن افسوس کہ اس عظیم انجمن کے قیام کے چند ہی دنوں بعد ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پچاس سال سے بھی کم عمر میں اس دار فانی سے رحلت فرماگئے، (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ثمرۃ التربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے عظیم ترین شاگرد ارشد مستقبل کے شیخ الہند پر آپڑی، چنانچہ اس تلمیذ رشید نے اپنے استاذ اجل کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد شروع کردی اس کے بعد متواتر تیس برس تک آزادی کے متوالوں اور ملت اسلامیہ کے نام لیواؤں کی یہ خفیہ انجمن نہایت رازداری کے ساتھ اپنے مقصد حقیقی کی طرف گامزن رہی اور ان منتخب افراد کے سینوں میں جذبات حریت بھڑکاتی رہی جن کے قلوب روح ایمانی سے معطر اور بدن جذبۂ شہادت سے سرشار تھے، اس انجمن کی سرگرمیاں اگرچہ ہندوستان میں رکی ہوئی نظر آتی تھیں لیکن قبائلی علاقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار شاگردوں کے ذریعہ یہ تحریک نہایت رازداری کے ساتھ سرگرم عمل تھی، اور تحریک کے روحِ رواں حضرت شیخ الہندؒ ان علاقوں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔(تجزیہ مولانا محمد میاں صاحب اسیرانِ مالٹا ۲۵)

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۳۱۵ھ نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو جو ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوکر اپنے وطن لوٹ گئے تھے دیوبند طلب فرمایا اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر علمی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام کرنے کی بھی تلقین فرمائی اور ان کو اپنی تحریک

کا ایک اہم رکن منتخب کرلیا، اس کے بعد مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کا سیاسی پروگرام لے کر اپنے وطن پہنچے اور اپنی عملی زندگی کا آغاز گوٹھ پیر جھنڈا حیدرآباد میں ''دارالرشاد'' نامی ایک مدرسہ کے قیام سے کیا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں سندھ کے گردونواح میں آزادی ہند کے لئے مخفی طریقہ سے کام جاری تھا، جس کی قیادت سرزمین سندھ کے عظیم المرتبت بزرگ خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی اس تحریک سے منسلک ہوگئے تھے کیونکہ حضرت دین پوریؒ آپ کے پیرومرشد بھی تھے، لیکن ۱۳۱۵ھ کے بعد جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تعلق ''تحریک شیخ الہند'' سے ہوا تو انھوں نے سندھی تحریک کو ''تحریک شیخ الہند'' کے ساتھ مربوط کر کے حضرت شیخ الہندؒ کو زبردست سیاسی قوت سے ہم کنار کیا، حضرت دین پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان تعلق پیدا کرنے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے عظیم الشان رول ادا کیا۔ (''ید بیضا'' حامی عبیدی)

قیام سندھ کے زمانہ میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحبؒ کا خفیہ رابطہ برابر دیوبند سے رہا اور حضرت شیخ الہندؒ سے برابر مشورہ لیتے رہے، حتی کہ ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں امتحان لینے کے بہانے سے حضرت شیخ الہندؒ کو سندھ کا دورہ کرایا اور یہاں پر ہونے والے کام سے متعارف کرایا۔ (داستان خانوادہ مولانا احمد علیؒ: ۵۸ /عبدالرؤف ملک، ید بیضا، ص: ۸۳ /علاوہ ازیں نقش حیات: ۱۹۶/۲، میں حضرتؒ کے امروٹ (سندھ) جانیکا تذکرہ ہے)

جمعیۃ الانصار

اس کے بعد اس جماعت کا ظہور ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء) میں ہوا یہ اصل میں ''انجمن ثمرۃ التربیت'' ہی کا ایک نیا لیبل اور عنوان تھا، جس کی تائید مولانا محمد میاںؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ھ کا ہنگامہ خیز دور جس میں بقول سر ونیزل انیٹس گورنر پنجاب، ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے موقع تھے، ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا

کیا نتیجہ نکلتا ہے،''(یہ زمانہ) حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کی جماعت کے لئے ایک حیات بخش دور تھا جس کی تمہید خفیہ طور پر ستائیس سال پیشتر کی جا چکی (یعنی ثمرۃ التربیت کے قیام کے ذریعہ) چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی''۔ (علمائے حق، ۱/۱۳۰/۳)

اس اہم ترین جماعت کی ادارت کی ذمہ داری حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلا کر سپرد کی، چنانچہ خود مولاناؒ ذاتی ڈائری صفحہ ۲۰ میں تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۲۷/۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا، چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا''۔

یہ تحریک یا تنظیم کیوں کہ عام لوگوں کے لیے جدید تھی اس لیے اس کو لوگوں میں متعارف کرانے کے لیے دارالعلوم کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، یہ عظیم اجتماع ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ (علمائے حق ۱/۱۳۱) اس طرح کا اجتماع اس زمانہ میں کسی جماعت کو نصیب نہ ہوا تھا، اجتماع میں ہر طبقہ کے لوگوں نے شرکت کی ان میں ایک معتد بہ مقدار ان لوگوں کی تھی جو ثمرۃ التربیت کے قیام کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے، ان کو اس جلسہ کے ذریعہ مل بیٹھنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا چنانچہ اس عظیم الشان اجلاس میں سندھی تحریک آزادی کے قائدین خواجہ غلام محمد دین پوریؒ اور مولانا تاج محمود امروٹیؒ بھی شریک ہوئے تھے۔ (ید بیضا ۱۰۷) اس کے علاوہ اس جلسہ سے جمعیۃ الانصار کا تعارف بھی بحیثیت تنظیم فضلاء دارالعلوم لوگوں میں ہو گیا تھا اس کے بعد اپریل ۱۹۱۱ء میں شہر مرادآباد میں جمعیۃ کا پہلا باقاعدہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید احمد حسنؒ نے فرمائی آپ نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں وضاحت کی کہ:

''بعض نئ روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی شن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں، جمعیۃ الانصار کی تحریک غالبًا اب سے تیس سال پہلے شروع ہوگئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور فنون کے آفتاب ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر بھی ناز کرے کم ہے''۔ (علمائے حق ۱۳۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی ہمہ گیر اور منظم تحریک کی ابتدا ثمرۃ التربیت سے کی تھی اور بعد میں ازسرنو تنظیم کے لیے جمعیۃ الانصار نام تجویز کیا۔

جلسہ مرادآباد کے بعد جمعیۃ کے پانچ چھ جیسے ملک کے مختلف حصوں میں ہوئے جن میں شملہ، میرٹھ، دیوبند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس جمعیۃ کے ذریعہ عوام سے رابطہ اور تعلق کی ایک صورت پیدا ہوئی، اور مسلم سیاست پر جو ایک عرصہ سے جمود طاری تھا اس میں کافی حد تک کمی آگئی، تقریباً چار سال تک یہ انجمن باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتی رہی اور لوگوں پر اس تحریک کا مثبت اور مؤثر اثر رونما ہوا لیکن حکومت افرنگیہ کے کان بھی اس نئ تحریک کو دیکھ کر کھڑے ہونے لگے، کیوں کہ انگریز کو معلوم تھا کہ اس تنظیم کا قائد شیخ الہندؒ اس مجاہد دوراں کا تربیت یافتہ ہے جس نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کردیا تھا، اور حکومت وقت کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اگر یہ تحریک چلتی رہی تو بہت جلد ہی انگریز کو ہندوستان سے دربدر ہونا پڑے گا۔ یہ رپورٹیں حضرت شیخ الہندؒ اور دارالعلوم کے منتظمین کو پہنچ رہی تھیں جس کی بنا پر یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں جمعیۃ الانصار کی وجہ سے حکومت دارالعلوم کو نقصان پہنچادے، اتفاق سے اس عرصہ میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ میں چند علمی مسائل میں اختلاف پیدا ہوگیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے ان اختلافات کو بنیاد بنا کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی جانے کا حکم مرحمت فرمایا، اور جمعیۃ الانصار کی نظامت سے آپ سبک دوش ہوگئے۔ (نقش حیات ۲/۱۴۴)

نظارہ المعارف (القرآنیہ)

دہلی پہنچ کر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے دینی تربیتی مرکز کی بنیاد رکھی، جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک برابر کے شریک تھے۔ (نقش حیات ۲/ ۱۴۵) یہ مدرسہ بقول حضرت مولانا محمد میاں صاحب دردمندان حریت کے لیے جائے اطمینان اور آزادی کے ساعیوں کے لیے خفیہ مشورہ گاہ تھا۔ (اسیران مالٹا ۲۷) اس مدرسۂ آزادی میں طلبہ میں جذبات حریت کیسے پیدا کئے جاتے تھے؟ اس کی ایک جھلک مولانا شائق عثمانیؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''نظارۃ المعارف دہلی کے دوران قیام ہم لوگوں کو کبھی مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس طرح کا مضمون لکھنے کو دیتے تھے کہ اگر تم کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح چلاؤ گے''۔ (مجلۃ العلم کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء بحوالہ تاریخ دار العلوم دیوبند ۲/ ۱۰۸)

سیاسی حالات میں تبدیلی

جس وقت مولانا سندھیؒ نے نظارۃ المعارف قائم کی، یہ ۱۹۱۳ء کی ابتدا تھی، سرزمین ہند پر تو انگریزی مظالم تھے ہی اس کے علاوہ عالم اسلام پر بھی برطانوی چیرہ دستیاں بڑھ رہی تھیں، اہل اسلام کی تمناؤں کا مرکز، مسلمانوں کی امیدوں کا منبع، یورپ کا مرد بیمار ترکی انگریز اور اس کے حواریوں کے اکسانے سے بلقان وطرابلس بلغاریہ ومونٹی نگرو کی بھیانک جنگوں سے نبرد آزما تھا، حکومت برطانیہ کی خلافت عثمانیہ سے دشمنی واضح ہو چکی تھی اور پھر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کو زبردستی گھسیٹ کر اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کے وجود کو چیلنج کر دیا گیا تھا، یہ وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مسلمان کا دل رو رہا تھا، پورے عالم میں ایک سنسنی تھے، حزن وملال کے بادل محبان وطن پر چھائے ہوئے تھے، اور ابھی یہ جذبات اور زخم ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب سے مندمل نہ ہوئے تھے کہ کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کی غرض سے ایک مسجد کو شہید کر دیا

گیا جس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہوگئے ، یہ حالات اس بوریہ نشین ہند کے عظیم ترین انقلابی قائد حضرت شیخ الہندؒ پر بھی اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکے جو بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ دیکھنے میں منحنی اور لاغر ونحیف تھے مگر سینہ میں صبر واستقامت کا ایک کوہ گراں رکھتے تھے، بظاہر اپنے گوشہ عزلت میں سب سے الگ تھے لیکن ان کی نظر جہاں بیں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل ونہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں، عمر کے لحاظ سے بھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے لیکن بایں ہمہ اس کے درد وگداز اور جذب وسوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں میں اور جلوتوں میں، رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اجالے میں کبھی جنگ بلقان وطرابلس کے واقعات پڑھ کر آنسو بہاتے تھے اور کبھی اپنے ملک کی زبوں حالی ودرماندگی پر نوحہ کناں ہوتے تھے۔ (ماہنامہ برہان، ستمبر ۴۸ء مضمون مولانا اکبر آبادیؒ بعنوان ''علمائے ہند کا سیاسی موقف''، الجمعیۃ دار العلوم نمبر/ ۲۲۷)

منصوبہ کیا تھا؟

ان حالات کے رونما ہونے سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ منصوبہ تھا کہ تحریک کے نمائندے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر دینی مدرسوں کے قیام کے لیے جدوجہد کریں اور ساتھ ہی ساتھ جذبات حریت کو بھی ابھاتے رہیں تا آنکہ میدان بالکل ہموار ہوجائے اور ہر طرف سے حمایت کی امید قطعی ہوجائے تو ایک تاریخ میں یکلخت پورے ہندوستان میں بغاوت کردی جائے اور کسی دوسرے ملک کی مدد سے یاغستان آزاد قبائل کی طرف سے ملک پر حملہ کردیا جائے، ظاہر ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک طویل زمانہ کی ضرورت تھی۔ لیکن خدا کا کرنا کہ مندرجہ بالا واقعات سے پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر پھیل گئی، دوسرے جنگ عظیم شروع ہوجانے کی وجہ سے انگریز کو کسی بھی طریقہ سے نقصان پہنچانا ضروری ہوگیا لہذا تحریک جہاد فوراً شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ (تفصیل کے لیے ''تحریک شیخ الہندؒ'' ۶۵ تا ۶۸ دیکھیں)

یاغستان میں جہاد

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۴ء میں مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو حاجی ترنگ زئی کے پاس

پشاور روانہ کیا اوران کو پشاور سے یاغستان ہجرت کرنے کا حکم دیا اور یہ فرمایا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ میدان عمل میں آجانا اور سر بکف ہوکر کام شروع کر دینا ازبس ضروری ہے۔(نقش حیات ۲/۲۱۰) چنانچہ یاغستان کے موضع زیگی میں ریاست میں تحریک کا مرکز قائم کیا گیا اورحاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کی قیادت میں انگریز کے خلاف جہاد کا سلسلہ شروع ہوا، ابتدا میں مجاہدین نے برطانوی فوج کی پلٹنیں کی پلٹنیں گاجرمولی کی طرح کاٹ دیں اوردشمن کوزبردست نقصان پہنچایا لیکن بعد میں اسلحہ اور رسد کی کمی کے باعث اس سلسلہ کو بند کرنا پڑا اور حضرت شیخ الہندؒ کو یہ اطلاع پہنچائی کہ بغیر کسی حکومت کی پشت پناہی کے سلسلہ جہاد جاری رکھنا دشوار ہے۔(نقش حیات ۲/۲۱۲) اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ حتی الوسع مالی امداد کا خیال رکھتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایک عظیم حکومت سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز اور مولانا سندھی کا سفر کابل

بیرونی حکومتوں سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے سرگرم شاگرد حضرت مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجنے کا اردہ کیا تاکہ وہ حکومت افغانستان کو انگریز کے خلاف نبرد آزما ہونے پر آمادہ کریں اور خود حجاز مقدس جانے کا اردہ فرمایا تاکہ دولت عثمانیہ سے تحریک کے سلسہ میں مدد لی جاسکے، آپ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دہلی سے طلب فرمایا اور بغیر کوئی مفصل پروگرام بتائے ہوئے کابل جانے کا حکم دیا، حضرت مولانا عبیداللہ صاحبؒ کابل جانے کا واقعہ اپنی ذاتی ڈائری میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

’’۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے میری طبعیت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل وکرم سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور افغانستان پہنچ گیا‘‘۔

آگے چل کر لکھتے ہیں، ’’کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظّم شکل میں موجود ہے، ان کو

میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر ہونے لگا۔ (ذاتی ڈائری/۲۳)

الغرض مولانا عبیداللہ سندھیؒ کئی مہینہ مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے خفیہ طریقہ سے ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء یعنی آزادئ ہند سے ٹھیک ۳۲/سال پہلے افغانستان کی سرحد میں داخل ہوکر قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے جہاں تحریک کے خفیہ ممبران آپ کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ اور وہاں پہنچ کر آپ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے، ادھر حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر حکومت ہند آپ کو گرفتار کرنے کی مکمل ارادہ کر چکی تھی، جس کی اطلاع ڈاکٹر انصاری نے حضرت شیخ الہند کو دے دی تھی، اس لئے حضرت شیخ الہندؒ پہلی فرصت میں برطانوی قلمرو سے نکل جانا چاہتے تھے، اتفاق سے حج کا زمانہ قریب تھا، موقع کو مناسب سمجھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حج کے بہانے سے سفر حجاز کا قصد فرمایا ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے خود ہی جملہ مصارف ادا کردئے اور حضرت شیخ الہندؒ اپنے جاں نثار خادموں مولانا عزیز گل صاحب مدظلہ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ وغیرہ کے ساتھ حجاز مقدس کے لئے روانہ ہوگئے اور ۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء میں آپ بخیر وعافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے، دوران سفر حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن آپ آگے آگے رہے اور گرفتاری کا وارنٹ پیچھے پیچھے۔ (اسیران مالٹا ۳۸)

تحریک کے اہم مراکز

قبل اس کے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات اور حجاز میں حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں کو ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کے اہم مراکز پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے تاکہ تحریک کی ہمہ گیری اور تنظیم کا پتہ چل سکے، جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے تحریک کے مندرجۂ ذیل اہم ترین مراکز تھے۔ (۱) دیوبند (۲) دہلی (۳) دین پور شریف (۴) امروٹ شریف (۵) کھڈہ کراچی (۶) چکوال (۷) زیگی یاغستان۔

دیوبند

دیوبند کے مرکز کو حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز روانہ ہونے سے قبل تک اس اس عظیم ترین انقلابی تحریک کے ہیڈ کواٹر ہونے کا شرف حاصل رہا، یہاں بقول حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جس میں ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے انقلابی لیڈر اور تحریک کے خفیہ کارکن جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان آ کر ٹھہرتے تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ رات کی اندھیریوں میں ان لوگوں سے ملاقات کرتے اور ہدایات دیتے تھے حضرت اکثر بڑے بڑے لیڈروں کو تحریک میں شامل کرنے کے لئے ان کو دیوبند طلب فرماتے تھے، چنانچہ تحریک کے ایک وفادار اور جانباز سپاہی جناب خان عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ :

''دیوبند کے افغان طلبہ کی وساطت سے سرحد میں شیخ الہندؒ کو میری سرگرمیوں کا علم ہوا چنانچہ انھوں نے مجھے دیوبند طلب کیا اور اپنی تحریک میں شامل کرلیا''۔

خان صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ، جب میں دیوبند جاتا تو حضرت شیخ الہندؒ مجھے اپنے مکان میں خفیہ رکھتے، بسا اوقات وہ دیوبند سے باہر ایک غیر معروف مقام پر مجھ سے مل کر مجھے جو ہدایات و احکام دینے ہوتے عطا فرماتے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶ر جنوری ۵۸ء)

دہلی

اس مرکز کے قائد اور صدر بقول حضرت شیخ الاسلامؒ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے جو حضرت شیخ الہندؒ سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، جب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کی تو اس کی مرکزیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا، اس شہر کو جو سیاسیات ہند کا بھی مرکز عظمیٰ تھا یہ سعادت برابر حاصل رہی تا اینکہ تحریک کے راز فاش ہونے کے بعد نظارۃ المعارف کے نائب ناظم مولانا احمد علی لاہوریؒ گرفتار کر لئے گئے۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۰۱)

دین پور (سندھ)

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ شہر اصل میں قادری راشدی بزرگان کی چلائی ہوئی خفیہ تحریک

آزادی کا مرکز تھا، جس کی قیادت سندھ کے مقبول ترین وئی کامل خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرمارہے تھے اور بعد میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی انتھک جدوجہد سے یہ تحریک ''تحریک شیخ الہندؒ'' کے ساتھ مربوط ہوگئی تھی، چنانچہ اس ربط کے قائم ہونے کے بعد دین پور سرحدی علاقوں میں تحریک شیخ الہندؒ کا مرکز قرار پایا، اس مرکز کے ذریعہ جہاں لوگوں کی ذہن سازی کا کام لیا جاتا تھا وہیں جہاد کے لئے اسلحہ بارود وغیرہ بھی جمع کیا جاتا تھا، اس مرکز کے قائد حضرت دین پوریؒ کی خانقاہ کے صدر دروازے کے نیچے تہ خانہ میں گولہ بارود بنانے کی ایک فیکٹری تھی جس میں خانقاہ کے فقراء تندہی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ (دیکھئے ''ید بیضا'' ۱۲۰ مصنفہ حامی عبیدی)

دیوبند اور دین پور میں قوی رابطہ تھا، آپس کے ربط اور تبادلۂ اخبار کے حیرت انگیز نظام کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جب دیوبند سے کابل کے لئے روانہ ہوئے اور دین پور پہنچے تو فوراً حضرت دین پوریؒ نے دریافت فرمایا ارے تم کابل نہیں گئے؟ (ید بیضا ۱۲۱) گویا ان کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی آمد سے پہلے ہی پورے پروگرام کا علم ہو چکا تھا۔

امروٹ شریف

یہاں حضرت دین پوریؒ کے پیر بھائی اور تحریک شیخ الہندؒ کے ایک جانباز خادم حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ اقامت پذیر تھے اور آس پاس کے علاقوں میں بھی آزادی کی روح پھونکنے کا کام انجام دیتے تھے، جہاد آزادی کے لئے یہاں بھی زبردست تیاری تھی، اس مرکز کا بھی دیوبند کے مرکز سے قریبی تعلق تھا اور برابر ہدایات موصول ہوتی رہتی تھی۔

کھڈہ (کراچی)

یہ مرکز ایک مدرسہ کی شکل میں موجود تھا جس کی قیادت مولانا محمد صادق صاحب کراچویؒ فرماتے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور تحریک آزادی کے زبرست حامیوں میں سے تھے۔ (تاریخ دارالعلوم ۷۸/جلد دوم سید محبوب رضوی) اس مرکز کے نمائندوں کی خدمات کا اندازہ اس سے

لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب انگریز عراق پر حملہ کرنا چاہتا تھا تو مولانا محمد صادقؒ اوران کے رفقاء نے ''لس بیلا'' کے مقام پر بلوچی قبائل میں بغاوت کرادی جس کے نتیجہ میں نئ کمک نہ پہنچنے کی بنا پر عراق میں انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، حضرت شیخ الاسلامؒ نقش حیات میں لکھتے ہیں کہ ''اس بغاوت کی وجہ سے عراق میں جوانگریزی فوج محصور ہوئی تھی ابتداً اس کی تعداد تیس ہزارتھی اور جب حصار ٹوٹا ہے تو کل تیرہ ہزار افراد باقی بچے تھے''۔ گویا یہ بغاوت سترہ ہزار انگریزوں کی ہلاکت کا ذریعہ بنی۔ اس بغاوت کے جرم میں حکومت ہند نے مولانا محمد صادق کراچویؒ کو گرفتار کرلیا تھا۔ (نقش حیات ۲/ ۱۹۷)

چکوال (جہلم)

اس مرکز کے منتظم مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ تھے، جن کو جمعیۃ الانصار کے بانی ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ (بحوالہ نقش حیات ۲/ ۱۴۴) یاغستان کے آزاد علاقے میں سرمایہ پہنچانے کا کام مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ اور مولانا حمداللہ پانی پتیؒ انجام دیتے تھے۔ (دیکھئے تحریک شیخ الہند آخری حصہ ۸)

زیگی (باجوڑ، یاغستان)

یہ مرکز جہاد ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران قائم کیا گیا جب حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو جہاد شروع کرنے کے لئے یاغستان بھیجا تھا، یہاں جناب خان عبدالغفار خاں صاحب کا یہ بیان دستاویزی حیثیت رکھتا ہے:

''حضرت شیخ الہندؒ آزاد قبائل یاغستان میں ہمارے ذریعہ سے ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں وہ خود بھی آکر شامل ہونا چاہتے تھے، اس غرض کے لئے میں نے اور مولانا فضل محمودؒ نے آزاد قبائلی ریاستوں میں مرکز کے لئے موزوں مقام تلاش کرنے کے لئے انتہائی مشقتیں اٹھائیں، انگریز کی نگرانی کافی سخت تھی اس کے باوجود ایک مرکز ''زیگی'' ریاست باجوڑ میں قائم کرنے کی کامیابی ہوئی''۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶ رجنوری ۸۵ء)

حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ۱۹۱۴ء میں اسی مرکز سے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے زیرقیادت تحریک جہادشروع ہوئی جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔لیکن انگریزی ڈپلومیسیوں اور رسد کی کمی کے باعث جب جہاد کا سلسلہ بند ہوا تو حاجی صاحبؒ ریاست مہمند میں مقیم ہوگئے تھے،اور حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب وغیرہ کابل روانہ ہوگئے۔(نقش حیات ۲/ ۱۸۸)

ان مراکزمشہورہ کےعلاوہ حضرت شیخ الہند کے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعداس کوبھی مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی،وہاں اگرچہ پہلے سے حضرت شیخ الہندؒ کےمحبوب شاگردحضرت شیخ الاسلامؒ اقامت گزیں تھےمگراس وقت تک ان کوسیاسیات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔(تفصیل کے لیے دیکھئےنقش حیات ۲/ ۲۱۵) حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز پہنچنے کے بعدحضرت شیخ الاسلامؒ نے باقاعدہ سیاست میں قدم رکھا تھا، مدینہ منورہ کے مرکزتحریک ہونے کی تائیداس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ’’الجنود الربانیہ‘‘نامی فوج کا ہیڈکواٹر مدینہ منورہ کوقرار دیا تھا۔(تحریک شیخ الہند۳۷۲)

اس کے علاوہ کابل کوبھی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے پہنچنے کے بعدتحریک کا ایک اہم مرکزسمجھا جانے لگا تھا،اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے پہلے ہی سے وہاں تحریک شیخ الہندؒ کے سرگرم کارکن موجود تھے،اس کی تائیدمولانا سندھیؒ کےاس عجیب وغریب حیران کن انکشاف سے ہوتی ہے جس کو فاضل مصنف قاضی عدیل عباسی نے اپنی کتاب ’’تحریک خلافت‘‘میں ذکرکیا ہے کہ :

’’مولانا منظورنعمانی سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچےتو جوکام انھیں کرنا تھا اس کے بارے میں ایک لفافہ خودامیرحبیب اللہ والی افغانستان نے ان کودیا‘‘۔(قاضی عدیل عباسی ۴۷)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کابل میں رہ کرمولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ذمہ داریوں کی تفصیل حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پہنچادی تھی،اورغالباً یہی وجہ ہے کہ دیوبند سے روانگی کے وقت حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کوکوئی مفصل پروگرام نہ بتلایا تھا۔

علاوہ ازیں اس بات سے بھی کابل میں تحریک شیخ الہند کے اثرات پائے جانے کوتقویت ملتی ہے کہ افغانستان کے قاضی القضاۃ قاضی عبدالرازق صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت گنگوہیؒ کے علم حدیث کے شاگرد تھے حضرت مولانا عبیداللہؒ جب کابل میں ان سے ملے اور انھیں اطمینان ہوگیا کہ یہی مولانا عبداللہ سندھیؒ ہیں تو قاضی صاحب کونہایت خوشی ہوئی تھی ۔(دیکھیے دارالعلوم کی تاریخ سیاست، شاہین جمالی ۱۱۹و۱۲۰)

اسلحہ کا کارخانہ

تحریک شیخ الہند کے انقلابی منصوبہ پرعمل کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر اسلحہ خانے بھی قائم تھے، اس سلسلہ میں ہم دین پور کے مرکز کی سرگرمیاں ذکر کرآئے ہیں، یہاں یہ واقعہ بھی جہاں دلچسپ ہے وہیں اپنے اندر ایک حکمت عملی کو چھپائے ہوئے ہے، ملاحظہ کیجیے :

عصر حاضر کے مشہور مصنف مولانا منظور احمد نعمانیؒ راوی ہیں کہ ان سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بتلایا کہ وہ کراچی میں تھے کہ شیخ الہندؒ کا ایک نامہ ملا، جس میں اُن کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ایک شخص فلاں دن فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا، وہ جو کچھ کہے اسے محفوظ کرلینا، اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا، چنانچہ کراچی کی مسجد میں ایک شخص آیا، اوراس نے میگزین کی تفصیل بتلائی، بندوق گولہ بارود وغیرہ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اس کومحفوظ کرلیا، اور جب دیوبند گئے تو حضرت شیخ الہندؒ کو بتلادیا، ان کو کچھ نہ معلوم تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ بعد میں لوگوں کے ذریعہ پتہ چلا کہ مولانا (شیخ الہندؒ) نے میگزین کا کوئی کارخانہ قائم کیا تھا، جہاں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے تھے، جس کا کوئی پتہ آج تک سی آئی ڈی کو نہ لگ سکا، لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا۔(تحریک خلافت ۴۷و۴۸)

اس روایت سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ تحریک کا نظام کس قدر رازداری سے چلتا تھا اور کہاں تک اس کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔

تحریک کا دائرۂ کار

تحریک شیخ الہندؒ سے متعلق چند اور باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے، چنانچہ جناب عبداللطیف کرت پوری جو بقول خود ایک عرصۂ دراز تک حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں رہے تھے، (تحریک خلافت ۴۵) بیان کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک جماعت مخلصین کے نام سے بنائی تھی، جس کے بہت ہی چنے ہوئے ارکان تھے وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں تو سب کچھ لکھ دیں گے مگر مخلص کا لفظ نہیں لکھیں گے، یہ لفظ صرف جماعت کے نہایت اہم ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ کسی کو لکھ دیں کہ یہ بہت مخلص ہیں ان کو دس ہزار روپیہ دے دو تو وہ مکان اثاث البیت غرضیکہ ہر چیز بیچ کر دس ہزار روپیہ ادا کر دے گا۔ (قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت ۴۵) جناب عبداللطیف صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی اسکیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت مولانا کی اسکیم یہ معلوم ہوتی تھی کہ سرحد کے قبائلیوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے اور اس طرح مجاہدین کی ایک زبردست فوج تیار کی جائے، چنانچہ چند علماء وہاں بھیجے گئے جو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن پاک کی شرح میں جو جہاد کی تعلیم ہے، اور جس سے ایک زمانہ سے علما صرف گذر جاتے ہیں اس پر سب سے زیادہ زور دینا طے تھا، انجام یہ ہوا کہ قبائلیوں میں زبردست جوش جہاد بھر گیا، اور وہ انگریزوں کے سخت مخالف ہو گئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو پستول کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا اور کام سے لوٹ کر آتا تو پوچھتا تھا کہ اے میرے بچے: آج تو نے کتنے انگریز مارے؟ وہاں اسلحہ خانہ بھی قائم ہو گیا تھا، رائفلیں اور پستول وہ لوگ خود بناتے تھے۔ (تحریک خلافت ۴۵)

بیرون ہند تحریک کے اثرات

جناب عبداللطیف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے شیخ الاسلام ترکی کے مفتی اعظم، شیخ الجامعۃ جامعہ ازہر اور علماء و مفتیان مصر حضرت شیخ الہندؒ کے ہم نوا تھے۔ (حوالہ مذکورہ ۴۵)

ایران میں مخلصین کا کارنامہ

شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جماعت مخلصین کے افراد ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے، اس سلسلہ میں عبداللطیف کرت پوری کا بیان کردہ مندرجہ ذیل واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے : وہ کہتے ہیں کہ ''جس زمانہ میں شاہ ایران نے اپنے ملک میں تمبا کو کی واحد ٹھیکہ داری انگریز کو دے دی تھی تو وہاں کے مجتہد العصر قابو میں نہ آتے تھے، چنانچہ جماعت مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اتارنے کا کام شروع کیا اور انگریز نگراں جب شراب پی کر بدمست ہوگئے تو ایک صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا اس میں تمباکو کے بجائے آلات حرب بند تھے، تب مجتہد العصر نے فتوی دیا کہ ''تمباکو نوشیدن دریں زمانہ حرام است'' رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلاف معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا، آواز دی تو کوئی نہیں بولا، بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے۔ ''من آواز می دہم وکس نمی شنود، ایں چہ ماجرا است؟''۔ تو بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور کہا کہ آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا تو بادشاہ نے فوراً دربار کیا اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ حضرت یہ فتوی کیسا ہے؟ اسلام تو ایک عالم گیر مذہب قیامت تک کے لیے ہے، یہ کیا کہ تمباکو پینا اس زمانہ میں حرام اور دوسرے میں حلال، ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال، تو مجتہد العصر نے بادشاہ سے تنہائی کی درخواست کی اور پورا واقعہ بتلایا، اس طرح سے ایران میں انگریزوں کی تمباکو پر سے اجارہ داری ختم ہوئی۔ (تحریک خلافت ۴۶)

تحریک کے مذکورہ بالا انکشافات اگرچہ عام مؤرخین ذکر نہیں کرتے لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی عظیم انقلابی تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں، اور اس طرح کے نہ جانے کتنے مراکز اور نہ معلوم کتنے واقعات ہوں گے جو آج انہی متعلقہ افراد کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر چکے ہیں۔

بہر حال تاریخ کے ان دھندلے نقوش سے تحریک کے بارے میں جو عظیم تصور قائم ہوتا ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مراکز میں رابطہ کا ایک خفیہ اور زبردست نظام تھا جو ہمیشہ متحرک رہتا تھا۔

بزرگوں کی کرامت

تحریک شیخ الہندؒ کے ان مراکز کا آپس میں ربط اور احکامات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت راز داری کے ساتھ منتقلی، اور وہ بھی ایسے نازک دور میں جب سگانِ فرنگ جگہ جگہ سازشوں کی بوسونگھتے پھرتے تھے، ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور قریہ قریہ میں سی آئی ڈی کے سفید پوش افراد متعین تھے، کسی اور کے نزدیک راز کے فاش نہ ہونے کی چاہے جو وجوہات ہوں راقم الحروف اس کو ان بزرگوں اور عارفین عظام کی کرامت سمجھتا ہے، جن کے اخلاص کو دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے تھے، جن کے جذبۂ ایمان کا مشاہدہ کر کے قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی جو تحریک آزادی میں جاہ و منصب، عزت و شرافت کے لیے نہیں بلکہ شرعی فرض سمجھ کر شریک ہوئے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے پیغامات کو تحریک کے دوسرے مراکز تک پہنچانے میں حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز روانہ ہونے سے قبل آپ کو حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے پاس بھیجا تھا اور ان کی واپسی تک سفر کو موقوف رکھا تھا۔ (دیکھئے ''تحریک شیخ الہند'' آخری حصہ ۳۲) اس کے علاوہ خان عبدالغفار خان مرحوم کا بھی بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ حاجی ترنگ زئیؒ سے خط و کتابت کا کام انہی خان عبدالغفار صاحب کی وساطت سے انجام دیتے تھے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۵۸ء)

ایک عجیب طریقہ

علاوہ ازیں بعض لوگوں نے ان مراکز کے درمیان سفارت کا ایک عجیب و غریب طریقہ ذکر کیا ہے جس سے قطع نظر کر لینا بھی کلیۃً مناسب نہیں، چنانچہ پاکستان کے ایک پروفیسر جناب محبوب الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم کے عنوان پر اپنے ایک مضمون میں جو ماہنامہ بینات کراچی میں جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ:

''ایک شخص پشاور سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس حاضر ہوتا وہ کاغذ کے پھول اور گلدان بنانا جانتا تھا حضرت اسے کابل کے لیے خط دیتے وہ اسے پھول کی شکل میں بدلتا اور دیگر پھولوں کے ہمراہ گلدان کی صورت میں پشاور لے جاتا کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ کسی پھول میں خط بھی ہوسکتا

ہے۔اس طرح وہ شخص باقی پھول تو مقامی طور پر فروخت کردیتا لیکن اصل پھول کسی کابل والے کے ہاتھ تھمادیتا جواس غرض سے پشاور میں موجود تھا''۔(پروفیسر محبوب الرحمٰن مظفرآبادی بینات کراچی بابت جولائی ۸۰ء،ص ۴۴۔مذکورہ بالا واقعہ کی تائید فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے بھی مقالہ پڑھنے کے دوران فرمائی اور بتلایا کہ انہوں نے بذات خود گلدان بنانے والے معمر شخص سے ملاقات کی ہے،محمد سلمان)

اس طرح کے واقعہ کا ثبوت اگرچہ تاریخ جنگ آزادی کی عام کتابوں میں نہیں ملتا،لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی تحریکات کے لیے بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔

تحریک کے مراکز میں تعلق کے سلسلے میں ایک اور واقعہ اس جگہ قابلِ ذکر ہے،سندھ میں تحریک شیخ الہندؒ کے سب سے اہم مرکز دین پور کے قائد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے صاحب زادہ مولانا عبدالہادی صاحبؒ اپنے بچپن کا واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز کے بعد حضرت دین پوریؒ کے پاس ایک سرخ وسپید نوجوان مسجد میں آیا اور باادب ہوکر حضرتؒ سے مصافحہ کیا حضرت فوراً کھڑے ہوگئے (غالباً حضرت نے تحریک کا نشان یا اشارہ پالیا تھا) اور اس شخص کو اپنے ساتھ لے گئے،جماعت کے فقراء کیوں کہ حضرت کے مزاج شناس تھے اس لیے کوئی فقیر اس طرف نہیں گیا لیکن چوں کہ میں (راوی) بچہ تھا اس لیے قریب جاکر دل چسپی سے یہ کارروائی دیکھتا رہا،اس نو وارد نے اپنی مشہدی اتاری اور اپنی زریں کلاہ کو ادھیڑ ڈالا،اس میں سے زرد رنگ کا ایک ریشمی رومال برآمد ہوا جسے اس نے حضرت کی خدمت میں پیش کردیا''۔(ید بیضا ۱۳۴ و ۱۳۵)

یہ تھی تحریک کے مراکز اور ان کے درمیان رابطہ کی ہلکی جھلک۔اب ہم مقصد کی طرف لوٹتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کابل میں

پہلے ذکر آچکا ہے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ ہونے کا حکم دیا تھا،چناں چہ آپ نے وہاں پہنچ کر تحریک کے لیے انتھک جد وجہد شروع کردی،اگرچہ قدم قدم پر مصائب سدراہ ہوئیں،اپنوں اور غیروں نے دھوکہ دیا،لیکن آپ صبر کے پتلے بنے رہے اور کبھی بھی مایوسی کو پاس نہ آنے دیا۔

کابل میں رہ کر آپ کی اہم خدمات کو ''نقش حیات'' سے ملخصاً نقل کیا جاتا ہے۔

(الف) آپ نے ترک جرمن مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کی صحیح پوزیشن سمجھائی اور اپنی بات کو منوایا۔

(ب) عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاب سنگھ کو صحیح راستہ بتلایا، ان کو متفق کیا اور غلط راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا۔

(ج) آپ نے اپنا قوی اثر ارکین دولتِ افغانیہ میں پیدا کیا، اگرچہ امیر افغانستان سردار حبیب اللہ کو جنگ آزادی پر عملی طور سے آمادہ نہ کر سکے اور انگریز کی ڈپلومیسی سدراہ بنی تاہم امیر صاحب مرحوم نے آپ سے بہت تاثر حاصل کیا اور آپ کے لیے مفید مشورے دیئے جن میں ہندو مسلم اتحاد بھی ہے۔

(د) آپ نے عمومی طور پر ارکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کا کھلا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبرانِ جرگہ انہیں کے ہم خیال و ہم زبان تھے۔

(ہ) انہوں نے آئندہ آنے والے امیر امان اللہ خان کو اس قدر متأثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل آپ کا ہم خیال ہوگیا، اور انہوں نے دولتِ افغانیہ کے استقلالِ کامل کا اعلان کردیا اور جب افغان برطانیہ جنگ ہوئی تو آپ نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا، اور اپنی جنود اللہ کے تربیت یافتہ افراد کو بھی جنگ میں شرکت کا حکم دیا تا آنکہ برطانیہ کو شکست ہوئی، اس پر برطانیہ کے سفیر متعینہ کابل نے کہا تھا کہ ''یہ افغانستان کی نہیں عبیداللہ کی فتح ہے''۔ (ماخوذ از نقش حیات جلد دوم ۱۷۹ و ۱۸۰ ملخصاً)

اس کے علاوہ کابل میں رہ کر آپ کا ایک اہم کارنامہ جنود اللہ نامی فوج کی تشکیل تھا، جس کے سپہ سالار حضرت شیخ الہندؒ متعین کئے گئے تھے، اور بہت سے تحریک کے ممبروں کو ان کی سرگرمیوں کے مطابق میجر، جنرل، لیفٹنٹ کرنل وغیرہ کے عہدے دیئے گئے تھے، اس جماعت کا ہیڈ کوارٹر ''مدینہ منورہ'' کو قرار دیا گیا تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اور بھی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے ذکر کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں سرگرمیاں

دوسری طرف حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے جا چکے تھے، اور انہوں نے مکہ معظّمہ پہنچتے ہی وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے ہندوستان کی صحیح صورت حال سے ان کو مطلع کیا تھا اور آپ نے غالب پاشا مرحوم سے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام بھی حاصل کرلیا تھا جس میں مسلمانان ہند کو ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی، اس پیغام کو لے کر آپ خود ہی استنبول کے راستے سے یاغستان پہنچانا چاہتے تھے لیکن عراق پر انگریزوں کے حملے کی وجہ سے راستہ مخدوش تھا اس لیے غالب پاشا نے آپ کو براہِ استنبول یاغستان پہنچانے سے معذرت ظاہر کی، اس کے بعد آپ نے ''غالب نامہ'' (غالب نامہ کے لیے ایک مخصوص صندوق تیار کیا گیا تھا، جس کے تختوں کے بیچ میں غالب نامہ رکھ کر مولانا ہادی حسن خانجہانپوری کے سپرد کیا گیا جنہوں نے اس کو ہندوستان پہونچانے کی خدمت انجام دی اس کے بعد حاجی احمد مرزا نے تحریروں کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ نے ان کو سرحد پہنچایا) کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوستان بھیجنے کا انتظام فرمایا، اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو یہ خدمت سپرد کی کہ یہ تحریر سرحد اور آزاد قبائل میں بکمالِ احتیاط پہنچا دیں، اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں ترکی کے وزیر جنگ جناب انور پاشا اور شامی محاذ کے سربراہ جمال پاشا سے ملاقات کی اور ان سے بھی مختلف تحریریں اور وثائق حاصل کیے، ان وثائق کو لے کر آپ براہ ''مکران'' افغانستان پہنچنے کا ارادہ رکھتے تھے، چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر دوبارہ مکہ معظّمہ اور وہاں سے طائف تشریف لے گئے تاکہ غالب پاشا سے امداد حاصل کرسکیں، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ اچانک شریف مکہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور حضرت شیخ الہندؒ طائف میں محصور ہوگئے، کافی مشقتوں کے بعد مکہ معظّمہ آنا ہوا۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۱۴ و ۲۲۵ تا ۲۲)

غالب نامہ آزاد قبائل میں

ادھر ہندوستان کے راستہ سے مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعہ سرحد اور آزاد قبائل

میں غالب پاشا کا پیغام پہنچا جس سے مجاہدین کے جوش میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور انھوں نے انگریزی غلامی کے طوق کو اتار پھینکنے کا قصد کرلیا، جناب خان غازی کابلی کی تحقیق کے مطابق مولانا منصور انصاریؒ جن تحریروں کو لے کر کابل پہنچے تھے ان میں ایک تحریر حکومت مؤقتہ اور جنود ربانیہ کے ارکان کے نام حضرت شیخ الہندؒ کی تھی جس میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ۱۹ر فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ میں مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کریں، یہ حکم ایک زعفرانی رنگ کے ریشمی رومال پر تھا (۱) قلات اور مکران کے قبائل ترکی فوجوں کی قیادت میں کراچی پر حملہ آور ہوں (۲) غزنی اور قندھار کے قبائل ترک فوج کی مدد سے کوئٹہ پر یلغار بول دیں (۳) پشاور کے محاذ پر درہ خیبر کے مہمند اور آفریدی شینوازی قبائل حملہ آور ہوں (۴) اوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کی امداد سے حملہ کیا جائے (۵) اس تاریخ کو ہندوستان میں آزادی کا پرچم لہرایا جائے۔ (خدام الدین حضرت لاہوری نمبر ۳۰۲)

اگر خاں صاحب موصوف کی تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی تحریک میں کہاں تک مراحل طے کر چکے تھے اور کامیابی کی منزل ان سے کتنی دور رہ گئی تھی؟ جبھی تو مولانا محمد علی جوہرؒ اپنی مجلسوں میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ہمارے اذہان وخیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے۔ (نقش حیات ۲/۲۴۴) لیکن حضرت شیخ الہندؒ کچھ اور منصوبے بنا رہے تھے اور تحریک کے بارے میں تقدیر خداوندی کچھ اور ہی چاہتی تھی۔

تحریک کے راز کا افشاء

چناں چہ صرف ایک کارکن کی چوک سے وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا، اور اس عظیم تحریک کا راز فاش ہوگیا جو دارالعلوم کی سرزمین سے انجمن ثمرۃ التربیت کی شکل میں اٹھ کر پورے نصف عالم کو اپنے لپیٹ میں لے چکی تھی، اور جس کے قدم کامرانی کے بس لب بام تک پہنچ چکے تھے۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلے میں کابل میں ہونے والے کام کی تفصیل امیر تحریک حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنی چاہئے تاکہ مفید مشورے لیے جاسکیں اور آئندہ کا لائحۂ علم طے کریں، چناں چہ اس مقصد کے پیش نظر حضرت

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک خط حضرت شیخ الہندؒ کے نام ایک ریشمی رومال پر تحریر کیا، جس میں جنود ربانیہ اور حکومت موقتہ کے احوال کی تفصیل درج تھی، ساتھ ہی ایک خط سندھ کے مولانا عبد الرحیم صاحبؒ کو لکھا جس میں خط کو مدینہ منورہ پہنچانے کی ہدایت درج تھی، ایک تیسرا خط مولانا محمد میاں انصاریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے نام تھا۔ یہ تینوں خطوط جو ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۰/ جولائی ۱۹۱۶ء میں عبد الحق کو حوالہ کئے کہ وہ ان خطوط کو مولانا عبد الرحیم سندھیؒ کے پاس پہنچا دے، عبد الحق اگرچہ تحریک کا ایک ممبر اور قابل اعتماد شخص تھا لیکن نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ وہ خطوط اس نے اپنے سابق آقا رب نواز کے حوالہ کر دیئے جو انگریز کا کاسہ لیس تھا، رب نواز کے ساتھ چند دنوں پہلے یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ اس کا لڑکا شاہنواز ملتان سے بھاگ کر کابل میں مجاہدین سے مل گیا تھا، جس کی وجہ سے انگریزی حکام کی نظر میں رب نواز کی شخصیت مشتبہ ہوگئی تھی، بدنامی کے اس داغ کو زائل کرنے کے لئے اس نے یہ شرمناک حرکت کی کہ وہ خطوط عبد الحق سے لے کر ملتان ڈویژن کے کمشنر کو دے دئے۔ (تاریخ دار العلوم ۲/۲۰۱) بعد ازاں ان خطوط پر جب سی آئی ڈی مطلع ہوئی تو اس عجیب وغریب انکشاف سے قصر بکھنگم تک دہل گیا، پورے حکومت برطانیہ کے قلمرو میں زلزلہ آ گیا، حکام ششدر رہ گئے، برٹش انٹلی جینس کے کارندے اپنی ناکامی پر حیران رہ گئے، اور جب ان ظالموں کو کچھ ہوش آیا تو ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ تحریک کے نمائندوں کو گرفتار کر کے، ان کو سزائیں دے کر اور ان کو تکلیف میں مبتلا کر کے اپنے جذبہ انتقام کو سرد کریں، چنانچہ پورے ہندوستان میں- جہاں جہاں تحریک کا اثر ہونے کا شبہ تھا- چھاپے مارے گئے اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا حتی کہ شریف مکہ کے ذریعہ ترکوں کے خلاف ایک فتویٰ کو بہانہ بنا کر حرم محترم بیت اللہ المعظم سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے جاں نثار رفقاء حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا عزیر گل صاحبؒ، حکیم نصرت حسین صاحبؒ اور مولانا وحید احمد صاحب فیض آبادیؒ (موصوف حضرت مولانا سید صدیق احمد مہاجر مدنیؒ کے صاحب زادے اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے پیارے بھتیجے تھے، ہونہار اور ذہین عالم دین تھے، نوعمری کے باوجود عزیمت اور جواں مردی میں ممتاز تھے) کو گرفتار کرا کر مالٹا کے قید خانوں میں آہنی سلاخوں میں مقید کر دیا، وہاں

رہ کران صبر کے پیکروں نے قوم ووطن کے لئے جو مصائب اٹھائیں اور مظالم برداشت کئے وہ تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے جن کو یہ مختصر مضمون محیط نہیں ہوسکتا، ادھر کابل کی انگریز نواز حکومت سے حکومت برطانیہ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے رفقاء کے بارے میں زبردست احتجاج کیا جس کے نتیجہ میں مولانا سندھیؒ اوران کے رفقاء کوایک تنگ مکان میں بند کردیا گیا، مولانا محمد میاں صاحب کو کابل سے یاغستان روانہ کردیا گیا جہاں جا کرانھوں نے اپنا نام محمد منصورانصاری رکھ لیا جس سے سی آئی ڈی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد جب امیر امان اللہ کی حکومت آئی تو ان لوگوں کی رہائی اور واپسی ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے سب سے پہلی جلاوطن کانگریس پارٹی کو قائم کیا، بعدازاں ۱۹۲۳ء میں روس گئے، سات مہینہ وہاں رہنے کے بعد ترکی گئے، تین سال وہاں قیام کیا، پھر مکہ معظّمہ تشریف لے گئے، ۳۹ء میں وطن واپس ہوئے اور آزادی سے تین سال قبل ۴۴ء میں بمقام دین پور وفات پائی، اوراپنے پیرومرشد کے قریب دفن ہوئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ۔

اس طرح تحریک آزادی کی اس عظیم تحریک کے نظام عادی کو ختم کردیا گیا اور وہ منصوبہ ناکام ہوگیا جو حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز سے پہلے متعین فرمایا تھا مگر منصوبہ کی ناکامی کا اہم ترین سبب جنگ عظیم میں ترکی اوراس کے حلیف جرمنی کی شکست تھا، اگر حکومت ترکیہ اوراس کے حلفاء پوری طرح تحریک کی مدد کرتے تو آج ہمارے ملک کا نقشہ اور ہوتا۔

منصوبہ کی ناکامی کے بعد

شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ تحریک شیخ الہند جس وقت شروع ہوئی اس وقت ملک میں کاسہ لیسی کی فضا عام تھی انگریزوں کا خوف لوگوں میں اس قدر تھا کہ اس کا عشر عشیر بھی خوف خدائے قہار سے نہ تھا، ان حالات میں آزادی کے لئے کسی آئینی جدوجہد کا تصور ناممکن تھا، اس لئے حضرت شیخ الہندؒ نے انقلابی اور تشدد پر مبنی تحریک کا راستہ اپنایا، اوراپنے طور سے اس راہ میں وہ قربانیاں دیں جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا، یہ دوسری بات ہے کہ تدبیر پر ہمیشہ تقدیر غالب آتی رہی اور کارپرداز قضا وقدر کا یہی فیصلہ رہا کہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کا دردناک عذاب چکھتا

رہے، اوراس کی بظاہر صورت یہ ہوئی کہ انقلابی تحریک کے لئے جن دوملکوں (ترکی وجرمنی) سے تعاون حاصل کیا جاسکتا تھا وہ جنگ عظیم میں شکست سے دوچار ہوگئے اور برطانیہ عظمی صفحہ ہستی پر ایک زبردست طاقت بن کرسامنے آیا۔ (دیکھئے علمائے حق ۱/۲۰۱ء)

مالٹا سے اب نسیم جاں فزا آنے کو ہے

ابھی گذر چکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا میں اسارت کے دوران ہندوستان کے حالات بہت دگرگوں رہے، ابتدا میں حکومت کی طرف سے حضرتؒ کے متعلقین کو بہت ہراساں کیا گیا، جابجا چھاپے مارے گئے، گرفتاریاں ہوئیں وغیرہ وغیرہ، تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حالات معمول پر آگئے۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی جدائی آپ کے شاگردوں اور جانثاروں کے لئے ایک ایسی کسک تھی جس کی ٹیسیں رہ رہ کر دل میں اٹھتی تھیں اور بے قابو بنادیتی تھیں، اسی لئے دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران اور ملکی سطح کے سیاسی قائدین جو سب حضرت شیخ الہندؒ کے نیاز مندوں میں تھے برابر حضرتؒ کی رہائی کے لئے اپنی حدتک کوششیں کرتے رہے، انگریز افسران کے توسط سے وائسرائے تک سفارشیں بھجوائیں، وفود نے ملاقاتیں کیں، مگر کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملتا تھا، بالآخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب حکومت کی طرف سے یہ شاہی فرمان جاری ہوا کہ سیاسی قیدیوں کو جلد رہائی ملے گی، تو مایوسی کے بادل چھٹنے لگے اور اس مبارک گھڑی کا انتظار کیا جانے لگا جب ''اسیران مالٹا'' کی دید سے نگاہیں شادکام ہوں، اور اسی انتظار میں ایک ایک دن گنا جانے لگا، اس وقت لوگوں کے جذبات کیا تھے؟ اور عوام وخواص کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے لئے کیسی محبت ڈال دی گئی تھی؟ اس کا کچھ اندازہ درج ذیل بے تابانہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جو انتظار کے عالم میں دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ''القاسم'' و''الرشید'' میں مولانا سراج احمد رشیدی نے تحریر کئے تھے، چند بند آپ بھی ملاحظہ کریں:

مالٹا سے اب نسیمِ جاں فزا آنے کو ہے ❖ دل میں جاں آنے کو ہے عیسی ادا آنے کو ہے

وہ گئے تو زندگانی کا مزا جاتا رہا ❖ اب وہ آتے ہیں تو جینے کا مزا آنے کو ہے

اب لبوں پر خیر مقدم مرحبا آنے کو ہے ❖ قاسم خیرات کا وہ لاڈلا آنے کو ہے
بحرِ ہستی کا سفر آسان ہوگا بالیقیں ❖ کشتیٔ طوفاں زدہ کا ناخدا آنے کو ہے
ہو مبارک تجھ کو اے دارِ حدیث دیوبند ❖ وہ ترا شیخِ حدیثِ مصطفیٰ آنے کو ہے
پھر پھلے پھولے گا گلزار رشیدیؔ قاسمیؔ ❖ سالکو! گھبراؤ مت رہنما آنے کو ہے
حضرت آئیں گے حسینؔ احمد کو بھی لائیں گے ساتھ ❖ شیخ آنے کو ہے ساتھ میں اس پرفنا آنے کو ہے
شیخ حسین احمدؔ وحید احمدؔ، عزیزؔ باصفا ❖ دوستانِ باصفا کا قافلہ آنے کو ہے

(حیات شیخ الہندؒ ۱۱۲، ۱۱۳)

الغرض ہر طرف ایک اشتیاق کا عالم تھا اور سب لوگ حضرت کی آمد کی خوشخبری سننے کو بے تاب تھے، ادھر حضرت شیخ الہندؒ ۲۲ / جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ / مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانہ ہو چکے تھے، راستہ میں اسکندریہ میں کچھ عرصہ رکنا ہوا، پھر وہاں سے ''سویس'' پہنچے اور وہاں سخت مشکلات برداشت کیں، کئی مہینہ سویس میں رکنے کے بعد ''عدن'' کے لئے روانہ ہوئے ۱۳ / رمضان ۱۳۳۸ھ ۲۸ / مئی ۱۹۲۰ کو عدن سے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان بذریعہ تاریہ خبر بھیجی کہ ۸ / جون تک ہمارا قافلہ بمبئی پہنچ جائے گا، اس خبر نے پورے ہندوستان میں خوشی ومسرت کی لہر دوڑادی اور خصوصی متعلقین نے شدت گرمی اور رمضان المبارک کا مہینہ ہونے کے باوجود اپنے عزیز ترین قائد کے استقبال کے لئے بمبئی حاضری کا قصد کرلیا۔

۲۰ / رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ / جون ۱۹۲۰ء کو جب حضرت شیخ الہند کا مقدس قافلہ بمبئی کے ساحل پر پہنچا تو عوام کے علاوہ بڑی تعداد میں آپ کے متعلقین، تلامذہ اور سیاسی قائدین جن میں مسٹر گاندھی بھی شامل تھے آپ کے استقبال کیلئے گودی پر موجود تھے۔ دو دن آپ نے بمبئی میں قیام فرمایا، اسی دوران خلافت کمیٹی بمبئی کی طرف سے آپ کو استقبالیہ پیش کیا گیا اور آپ کو شیخ الہندؒ کے خطاب نوازا گیا جو بعد میں آپ کے اسم گرامی کا جزو بن گیا، ۲۲ / رمضان المبارک (۱۰ / جون) کو آپ بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۲۴ / رمضان المبارک (۱۲ / جون) کو دہلی رونق افروز ہوئے، دہلی کے اسٹیشن پر آپ کا پرتپاک استقبال کیا گیا، اگلے دن آپ دیوبند کیلئے روانہ ہوئے

راستہ میں ہر اسٹیشن پر آپ کی زیارت کے لئے خلق خدا اُمڈ پڑتی تھی، نعرۂ ہائے تکبیر کی گونج سے جابجا اسلامی شان وشوکت کا اظہار ہوتا تھا، اسی دوران آپ کے ایک عقیدت مند مولوی مظہر الاسلام صاحب نے درج ذیل قصیدہ پڑھ کو جوش وخروش مزید دوبالا کردیا:

دھوم ہے محبوبِ محبوبِ خدا آیا ہے آج ❖ وارث کل انبیا و اولیا آیا ہے آج

جس قدر جاتا رہا اس سے سوا آیا ہے آج ❖ کُل شہیدان وطن کا خوں بہا آیا ہے آج

لائے ہیں تشریف مولانا، مبارک دیوبند! ❖ خوش ہوا ے کنعاں کہ پھر یوسف ترا آیا ہے آج

وہ محدث، وہ جہاں اُستاد محمودالحسن ❖ یعنی شیخ الہند اسیر مالٹا آیا ہے آج

اے تماشہ دیکھنے والو خدا کی شان کا ❖ بھیس میں درویش کے فرماں روا آیا ہے آج

کل تلک جو غیر ممکن تھا وہ ممکن ہوگیا ❖ بیٹھ کر کشتی میں دریا علم کا آیا ہے آج

(حیات شیخ الہندؒ ۱۲۵)

غازی آباد میرٹھ، مظفر نگر، حتی کہ روہانہ جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی مشتاقان زیارت کی بھیڑ تھی بعض جگہوں پر تو زیارت کے لئے آپ کو چوکی پر بٹھانا پڑا، اور بالآخر جب گاڑی دیوبند پہنچی تو پورے پلیٹ فارم پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر سے فضا گونج رہی تھی اور لوگ پروانہ وار اپنے محبوب استاذ کی زیارت کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے، آپ سواری پر سوار ہوکر اولاً دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث میں رونق افروز ہوئے اور دعا فرمائی اور عشاق کو مصافحہ اور زیارت سے مشرف فرمایا اس کے بعد تقریباً ۱۵/ یوم دیوبند میں قیام فرمانے کے بعد اپنے رفیق سفر اسیر مالٹا حکیم حضرت مولانا حکیم نصرت حسین صاحبؒ (جن کا مالٹا میں اسارت کے دوران انتقال ہوگیا تھا) کے اہل خانہ سے تعزیت کے لئے فتح پور کا سفر فرمایا اور درمیان میں لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، غازی پور، فیض آباد اور مراد آباد وغیرہ بھی اترنا ہوا، ہر جگہ عاشقانِ زیارت کا مجمع قابل دید تھا، اور کھلے طور پر قبولیت کے آثار نمایاں تھے، ۲۵/ شوال کو آپ دیوبند واپس تشریف لے آئے، یہاں آپ کی اہلیہ مکرمہ شدید بیمار تھیں، اور بیماری بالکل

آخری مرحلہ تک پہنچ گئی تھی؛ تا آنکہ ۱۷/ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ کو مرحومہ نے سفرآخرت اختیار فرمایا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت شیخ الہند کی سیاسی سرگرمیاں

جس وقت حضرت شیخ الہند ہندوستان واپس تشریف لائے تو یہاں کی سیاسی فضا خاصی گرم تھی نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کا قیام عمل میں آچکا تھا جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء شامل تھے، اور خلافت تحریک زور وشور سے جاری تھی، حضرت شیخ الہندؒ نے ان تحریکات کو بہم قوت پہنچائی، چنانچہ آپ نے انگریز کے بائیکاٹ (ترک موالات) کے بارے میں ۱۹/جولائی کو ایک فتوی جاری فرمایا، جو بعد میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے کئی سو علماء کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔

جامعہ ملیہ کا قیام

تحریک ترک موالات ہی سے متاثر ہوکر مولانا محمد علی جوہرؒ کی کوشش سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو طلبہ نے یونیورسٹی چھوڑ کر اپنا الگ قومی ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''جامعہ ملیہ'' رکھا گیا، اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت کے لئے حضرت شیخ الہندؒ سے درخواست کی گئی، حضرت اس وقت سخت علیل اور صاحب فراش تھے، ضعف ونقاہت حد سے متجاوز تھی، لیکن قومی ضرورت کو ترجیح دیتے ہوئے علی گڑھ کے سفر پر تیار ہوگئے، اہل تعلق حضرات کے روکنے پر فرمایا کہ ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہونگا'' چنانچہ آپ اپنے خدام کے ساتھ بہ دقتِ تمام علی گڑھ کا سفر فرمایا اور ۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ (۱۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو جامعہ ملیہ کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے، لیکن ضعف اتنا تھا کہ خود خطبہ صدارت پڑھنے کی سکت نہ تھی چنانچہ آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ کی طرف سے خطبہ صدارت پڑھ کر سنایا، اس یادگار خطبہ کے چند اقتباسات ذیل میں پیش ہیں:

□ اپنی علی گڑھ آمد کی وجہ بتاتے ہوئے آپ نے کہا: ''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو! اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ، تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہوجاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے آلات ضرب وحرب کا''۔

□ کالج میں پڑھنے والے محبان قوم وملت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا: ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''۔

□ حضرت والا نے علماء کے خلاف انگریزی زبان کی مخالفت کے الزام کا جواب دیتے ہوئے یہ وضاحت فرمائی کہ: ''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر میں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں، یا عمداً گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں، یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں، تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کا جاہل رہنا اچھا ہے''۔

□ آپ نے مسلم کالجوں میں دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب رائج کرنے پر زور دیتے ہوئے فرمایا: ''ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ

اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اوران میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ضعیف درجہ کی رہ جائے، تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اوراس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو، اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔ (تحریکات ملی ۳۸۲، علماء حق اوران کے کارنامے ۱/ ۲۱۹)

علی گڑھ میں پانچ سال تک تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد یہ جامعہ ملیہ دہلی منتقل ہوگیا اوراس وقت اس کا شمار ملک کی اہم تعلیم گاہوں میں ہوتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کی توقعات کے برعکس اس ادارے کا ماحول بھی دیگر یونیورسٹیوں کی طرح روز بروز اباحیت اور بے دینی کی طرف گامزن ہے اور اسلامی کردار ذہنوں سے محو ہو چکا ہے جس پر انا للہ الخ کے علاوہ اور کیا پڑھا جاسکتا ہے۔

دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس عام

جامعہ ملیہ کے قیام کے ٹھیک ۲۰/ دن بعد جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس دوم دہلی میں ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۷ تا ۹ / ربیع الاول ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوا، حضرت شیخ الہندؒ علی گڈھ سے دیوبند واپس تشریف لے آئے تھے، لیکن صحت برابر گرتی جارہی تھی۔ اس لیے بغرض علاج دہلی کا سفر فرمایا اور حسب معمول ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ خدام جمعیۃ کی خواہش تھی کہ حضرت والا ہی جمعیۃ کے اجلاس کی صدارت فرما کر ممنون فرمائیں، چنانچہ حضرت نے دیوبند واپسی مؤخر فرمادی اوراجلاس کے لیے ایک وقیع خطبۂ صدارت مرتب کرایا، لیکن اجلاس کے ایام میں ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بنفس نفیس اجلاس میں شرکت نہ ہوسکی اور آپ کی طرف سے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند نے خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا: اس طویل خطبہ میں آپ نے قرآن وسنت کی روشنی میں اولاً مسلمانوں کو حق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین فرمائی۔ اور عالم اسلام پر انگریزوں کی چیرہ دستیوں کو کھل کر بیان فرمایا۔ اس کے بعد حالات کی نزاکت اور وقت کی

مصلحت کو محسوس کرتے ہوئے آزادئ ہند کی جد وجہد میں حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے برادران وطن کے ساتھ تال میل بنائے رکھنے پر بھی زور دیا آپ نے فرمایا :

''برادران وطن نے تمہاری اس مصیبت میں جس قدر تمہارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کررہے ہیں وہ ان کی اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے، اسلام نے احسان کا بدلہ احسان قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دیدیں، کسی دوسرے کی چیز کو اٹھا کر دے دینے کو احسان نہیں کہتے، اس لیے آپ برادران وطن کے احسان کے بدلہ میں وہی کام کرسکتے ہیں، جو اخلاقی اور شریفانہ طور پر اپنے اختیارات سے کرسکتے ہوں، مذہبی احکامات خدا کی امانت ہیں، ان پر تمہارا اختیار نہیں ہے، اس لئے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلے میں احسان کرو، اور دونوں قومیں مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے کے لئے کھڑے ہوجاؤ جو تمہارے مذہب، تمہاری آزادی کو پامال کررہا ہے''۔

خطبۂ صدارت کے علاوہ اجلاس کی آخری نشست کے لئے آپ نے ایک خصوصی پیغام بھجوایا جس میں اجلاس کی کامیابی اور علماء کی دل جمعی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اس کی حدود کی نزاکت کو بھی آشکارا فرمایا آپ نے پیغام دیا کہ:

''کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے، اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں، اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کررہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے''۔ آگے اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

''ہاں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلیجئے اور وہ حدود یہ ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنی امر کو بھی ہاتھ

نہ لگایا جائے، اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ (جمعیۃ علماء ہند مجموعہ خطبات صدارت وغیرہ ۲۳؍۷۷)

اس آخری پیغام کے مذکورہ بالا الفاظ درحقیقت جمہوری اور سیکولر ہندوستان کے لئے ایک ''بنیادی چارٹر'' کی حیثیت رکھتے ہیں، اور آج بھی مذکورہ اصول وحدود پر عمل، پورے ملک میں امن کا ضامن ہے، جس کا لحاظ رکھے بغیر ہرگز امن قائم نہیں رہ سکتا ہے۔

سفر آخرت

حضرتؒ کی علالت اور روز بروز بڑھتی جاتی تھی جمعیۃ کے اجلاس کی وجہ سے دیوبند واپسی کو مؤخر کیا تھا، اجلاس کے بعد جلد ہی واپسی کا ارادہ تھا۔ لیکن ابھی یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا تھا کہ اجلاس کے صرف ۸؍دن کے بعد ۳۰؍نومبر ۱۹۲۰ء ۱۸؍ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو علم وعمل کا یہ آفتاب عالم تاب، اسلامی سیاست کا نقیب اعظم، سپہ سالار قافلۂ حریت، اپنے ہزاروں متعلقین وتلامذہ کو روتا بلکتا چھوڑ کر یہ تمنا لے کر اپنے رب ایزدی کے حضور پہنچ گیا کہ ''افسوس ہے کہ بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے''۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی، دہلی میں آناً فاناً بازار بند ہوگئے۔ لوگ دیوانہ وار ڈاکٹر انصاریؒ کی کوٹھی کی طرف دوڑ پڑے، اعزاء کے اصرار پر جنازہ دیوبند لے جانے کا نظم کیا گیا، روانگی سے قبل کثرت ہجوم کی وجہ سے دو مرتبہ نماز جنازہ دہلی میں ادا ہوئی۔ پھر میرٹھ شہر، اور میرٹھ چھاؤنی میں بھی نماز جنازہ ادا کی گئی اور آخری مرتبہ دیوبند میں احاطۂ دارالعلوم میں نماز جنازہ پڑھی گئی، آپ کے برادر معظم حضرت مولانا حکیم محمد محسن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی، اور بقعۂ صالحین ''مزار قاسمی'' میں اپنے استاذ معظم کے قدموں میں اس قابل فخر شاگرد کی تدفین عمل میں آئی، جنازہ میں اس قدر مجمع تھا کہ دیوبند میں قبل ازیں کسی جنازہ میں اتنا اجتماع نہیں دیکھا گیا۔

جوآپ کی مقبولیت عنداللہ وعندالناس کی کھلی دلیل ہے۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمةً واسعةً، وأسكنه فسيح جنانه، برحمتك يا أرحم الراحمين.

تحریک جاری رہی

شیخ الہندؒ وفات پا گئے، لیکن آپ نے زندگی بھر جس فکر کی آبیاری کی تھی وہ بدستور زندہ اور متحرک رہی اور اس سے وابستہ افراد آخر دم تک قوم وملت کی مخلصانہ خدمت میں لگے رہے، ان میں سرفہرست آپ کے محبّ ومحبوب خادم اور نابغۂ روزگار شاگرد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کا اسم گرامی ہے۔ جو بالاتفاق اپنے استاد معظم کے سچے جانشین قرار پائے اور انہوں نے اپنے محیر العقول مجاہدانہ کارناموں سے یہ ثابت کردکھایا کہ واقعۃً وہی اس اعزاز کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ چنانچہ انہی کے دور قیادت میں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے ۲۷ رسال بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ اور ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی خلیج کے دسیوں مسلم ممالک بھی انگریزی دست برد سے نجات پا گئے۔ اور اکابر کا تقریباً ایک صدی پہلے دیکھا گیا خواب شرمندہ تعبیر ہوگیا۔

علمی یادگاریں

اللہ تعالی کو حضرت شیخ الہندؒ کے لیے عظیم الشان صدقۂ جاریہ کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے لیے قدرتی اسباب بنتے چلے گئے۔ آپ نے عزم کیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن کی اردو پرانی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے عوام کو اس الہامی ترجمہ سے استفادہ مشکل ہوتا ہے، لہٰذا ترجمہ کو آسان اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ اس کا فیض زیادہ سے زیادہ عام ہو، چنانچہ آپ نے توکلاً علی اللہ یہ نازک اور اہم کام دیوبند میں ۱۳۲۷ھ میں شروع فرمادیا، یہاں کئی سال گذر گئے تھے مگر مختلف النوع مشغولیات کی وجہ سے اس کام میں وقت زیادہ نہیں لگ پاتا تھا، اور کام کی رفتار سست تھی تا آنکہ آخری سفر حجاز پیش آیا، اور پھر وہاں سے آپ مالٹا پہنچادئے گئے آپ نے موقع کو غنیمت سمجھا اور پورے انہماک اور یکسوئی سے مالٹا میں رہتے ہوئے ترجمۂ قرآن پاک اور ساتھ میں تقریباً چار پارے کے تفسیری اشارات مرتب فرمادئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مالٹا کی اسارت نہ

ہوتی تو بظاہر حالات اس اہم کام کی تکمیل دشوار تھی، اس اعتبار سے مالٹا کا قیام بھی ایک عظیم نعمت کا سبب بن گیا، بعد میں تفسیری اشارات کی تکمیل حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمائی۔ اور یہ ''ترجمۂ شیخ الہند'' برصغیر میں اس قدر مقبول ہوا جس کی قریبی زمانہ میں نظیر نہیں ملتی۔ چند سال قبل مجمع الملک فہد، مدینہ منورہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی طرف سے بھی لاکھوں کی تعداد میں اس کی اشاعت کرا کے سارے عالم میں اس کی تقسیم کی گئی تھی، بلا شبہ یہ ترجمہ آپ کے لئے عظیم الشان صدقۂ جاریہ ہے، علاوہ ازیں ایضاح الادلہ ادلۂ کاملہ، الابواب والتراجم، حاشیہ مختصر المعانی وغیرہ یادگار کتابیں ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات عالیہ کو بے حد قبول فرمائے اور امت کو تا دیر آپ کے فیوضات عالیہ سے استفادہ واستفاضہ کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

نوٹ :- اِس مقالہ میں تحریک شیخ الہند سے متعلق حصہ، راقم الحروف نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ ''شیخ الہند سیمینار'' (بتاریخ یکم جنوری ۱۹۸۶ء) میں پیش کیا تھا، اس وقت احقر دارالعلوم دیوبند میں درجہ ششم عربی کا طالب علم تھا۔ غالباً یہ احقر کا پہلا تحقیقی مقالہ تھا، جسے سیمینار کی دوسری نشست (منعقدہ مدنی ہال دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی) میں ہندوپاک کے اہم علماء واکابر کے مجمع میں پڑھ کر سنایا گیا، اور بحمدہ تعالیٰ حضرات سامعین نے توقع سے زیادہ حوصلہ افزائی اور پذیرائی سے نوازا۔ بالخصوص محسن ومشفق بزرگ اور باذوق مؤرخ ومحقق حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نور اللہ مرقدہ نے توجہ سے سن کر اظہار مسرت فرمایا اور دلی دعاؤں سے سرفراز کیا، فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

بعد میں یہ مضمون متعدد رسائل میں شائع ہوا، پاکستان کے بعض احباب نے اسے الگ کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کیا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ (مرتب)